مشرق اور تحریکِ استشراق

*ڈاکٹر روبینہ شہناز/ محمد نوید ازہر**

Abstract:

The term "orientalism" was coined for the orient by the Europeans. The Europeans had known the name of the orient since the times of Homer. When they started migrating to the oriental countries due to various reasons, they found these countries richer in natural resources. The abundance of human amenities and the artistic and academic activities attracted the western communities. These occidental communities consider the eastern people inferior but indispensible for their interests. To know about the orient and the oriental studies has become a movement now. Over the years, such movement of the orientalism has become organized and active.This article is based upon the famous book of Edward Saeed.

مشرق کے لیے مشرق کی اصطلاح یورپ ہی نے ایجاد کی ہے لیکن اس نے کبھی مشرق کی حدود کو متعین نہیں کیا۔ کبھی بحیرہ روم کو دنیا کا مرکز قرار دے کر مشرق و مغرب کا تعین اس کے حساب سے ہوتا رہا اور کبھی بائبل میں مذکورہ ممالک کو مشرق سے موسوم کیا جاتا رہا۔ یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ مشرق کے جغرافیہ میں اہلِ مغرب حسب ضرورت اپنے مفادات کی خاطر تبدیلی کرتے رہتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آغاز سے جنگ عظیم دوم تک مشرق پر فرانس اور برطانیہ قابض تھے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد مشرق پر امریکا نے اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ امریکا مشرق کے ساتھ فرانس اور برطانیہ جیسا رویہ ہی اختیار کیے ہوئے ہے، لیکن اس کے خودغرضانہ مشرقی جغرافیہ میں چین اور جاپان بھی موجود ہیں۔ مشرق ایک طرف جغرافیائی اعتبار سے مغرب سے قریب تر ہے اور دوسری طرف یورپی

* صدر شعبہ اُردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

** شعبہ اُردو، گورنمنٹ گورڈن کالج راولپنڈی

تہذیبوں اور زبانوں کا مرکز بھی رہا ہے کیوں کہ اس میں یورپ کی دولت مند ترین اور قدیم ترین نو آبادیاں رہی ہیں۔ اس بناء پر اسے یورپ ثانی بھی کہا جا سکتا ہے۔ نیز مشرق، مغرب کے مدمقابل اپنی تہذیب وثقافت کا امین ہے۔ مشرق ہی کی موجودگی نے مغرب کا تشخص اجاگر کیا۔ مشرق کی رومانوی فضاء، علوم وفنون، حالات وواقعات کی اثر آفرینی، خوش گوار آب وہوا اور وسائل آمدن نے مغرب کو مشرق کی طرف متوجہ کیا۔ یورپ میں موسموں کی شدت، زندگی کے بنیادی وسائل کے فقدان، بنجر اور بے کار زمینوں اور خوراک کی عدم دست یابی نے اہل یورپ کو مغربی ممالک کی طرف ہجرت پر مجبور کیا، جس سے ہومر کے زمانے ہی سے ان کا تعارف ہو چکا تھا۔ اسی ربطِ باہمی نے مشرق اور مغرب کے مابین تمدنی اور ثقافتی رشتہ استوار کیا جس سے استشراق کو وجود ملا۔ انیسویں صدی تک استشراق کو ایک منظّم اور فعال تحریک کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

تحریک استشراق اور مستشرقین کے وجود کے بارے میں پیر محمد حسن لکھتے ہیں:

> ''جب اہل یورپ نے اپنے گم کردہ وقار اور کھوئے ہوئے عروج کا احساس کیا تو انہوں نے اس کھوئے ہوئے وقار کو صحیح معنوں میں اور صحیح اصولوں پر پھر سے حاصل کرنے کی ٹھان لی اور اس مقصد کے حصول کے لیے کما حقہ، کوشش بھی کی۔ دیکھتے دیکھتے وہ دنیا بھر کے استاد اور رہنما بن گئے۔ اور انہوں نے ہر فن میں دیگر اقوام سے اپنا لوہا منوایا اور ان کے دلوں پر اپنی فوقیت کی دھاک بٹھا دی۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ ہر فن اور شعبہ علم میں ان کی ہر بات حجت مانی جاتی ہے تو انہوں نے علوم شرقیہ کی طرف توجہ دینا شروع کر دی اور اس طرح مستشرقین کی ایک جماعت کی بنیاد رکھی۔ اس جماعت کی بنیاد رکھنے والوں کی نیت علوم عربیہ اور علوم اسلامیہ کی خدمت کرنے کی نہ تھی بلکہ یہ تخریبِ اسلام مسلمانوں میں الحاد وزندقہ پھیلانے، ان کو شبہات میں ڈالنے اور ان کے عقائد کو بگاڑنے کی غرض سے بنائی گئی تھی۔ اس جماعت میں ابتداء سے لے کر آج تک جتنے لوگ شامل ہوتے رہے وہ سب کے سب عیسائی مشنریوں اور پادریوں کے گھرانوں سے تعلق رکھنے والے تھے۔''(۱)

مشرق اور مغرب کے مابین تجارتی روابط، بائبل سے متعلق کتب اور سرزمین بابل کی کشش، مذہبی فرقوں، مستشرقین کی روز افزوں تعداد جیسے عناصر نے مل کر استشراق کو استحکام بخشا۔ اس تعلق کی بنیاد پر بہت سا ادب اور بہت سی کتب بھی وجود میں آئیں جو اپنے مخصوص مزاج اور طرزِ فکر کی وجہ سے ایک ہی تحریکِ استشراق کا حصہ ہیں۔ مستشرقین، ''جن کی علمی خدمات کا آغاز 1498ء سے ہوا''(۲) کی تحقیقات میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے جن کا بڑا مقصد مشرقی دنیا پر اپنی برتری ثابت کرنا ہے۔ غیر مغربی دنیا سے متعلق اہل مغرب کی معلومات کے بارے میں ایڈورڈ سعید لکھتے ہیں:

''مغرب کو غیر مغربی دنیا کے متعلق زیادہ تر باتیں نو آبادیاتی نظام کے زمانے میں معلوم ہوئیں چنانچہ یورپی سکالروں نے اس صورت حال میں جب کسی معاشرے کا مطالعہ کیا تو ان کا مقام اور حیثیت ایک غالب اور برتر کی تھی، چنانچہ حاکم نے جب محکوم کے متعلق کچھ جاننا چاہا، سمجھنا چاہا تو اس پر حاکمیت غالب آ گئی، اس صورت میں اس نے اپنے موضوع کی مناسبت سے جو کہا، اس میں دوسروں کے اور مقامی حوالے شامل نہیں تھے، بلکہ اس سے پہلے جو دوسرے یورپی باشندے لکھ چکے تھے، اس نے انہیں ہی اپنا حوالہ بنایا اور اپنے مطالعے کو خود ہی محدود کر لیا۔۔۔۔۔۔اسلام اور اسلامی عوام کا جو مطالعہ کیا گیا ہے، اسے نہ صرف بالادستی اور مخالفت بلکہ ثقافتی منافرت کے مقام پر بیٹھ کر مکمل کیا گیا ہے۔''(۳)

مستشرقین اور استشراق کے بارے میں جو کتاب ہمیں تفصیلی معلومات مہیا کرتی ہے وہ ایڈورڈ سعید (۱۹۳۵ء۔۲۰۰۳ء) کی ''اورینٹلزم (Orientalism) '' ہے۔ایڈورڈ سعید ایک خوش حال فلسطینی گھرانے میں پیدا ہوئے۔وہ مذہباً عیسائی تھے۔۱۹۴۷ء میں جب فلسطین کی تقسیم کا واقعہ پیش آیا تو ان کے خاندان کو مجبوراً قاہرہ (مصر) کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔وہ پرنسٹن یونی ورسٹی اور ہارورڈ یونی ورسٹی (امریکا) میں زیرِ تعلیم رہے۔۱۹۶۰ء میں انگریزی میں ایم۔اے کرنے کے بعد انہوں نے دو سال میں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کر لی۔۱۹۶۳ء میں وہ کولمبیا یونیورسٹی میں تدریسی خدمات سرانجام دینے لگے اور باقی عمر انگریزی اور تقابلی ادب کی تدریس میں صرف کی۔(۴)

"Orientalism" ایڈورڈ سعید کی مشرقیت پر لکھی گئی تمام کتابوں میں سے سرِفہرست ہے جس کا دنیا کی ۳۶ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔اس کتاب میں انہوں نے مغرب کے خود غرضانہ چہرے کو بے نقاب کیا ہے اور اہلِ مشرق کے ساتھ اس کے برتاؤ پر روشنی ڈالی ہے۔وہ مستشرق کی تعریف یوں کرتے ہیں:

''جو کوئی بھی مشرق کے بارے میں پڑھتا، لکھتا یا اس پر تحقیق کرتا ہے تو یہ تحقیقی معیار تمام تر پڑھنے، لکھنے اور تحقیق کرنے والے ماہرینِ بشریات، عمرانیات، تاریخ اور لسانیات پر منطبق ہوتا ہے۔خواہ یہ لوگ اپنے اپنے دائرہ تخصص میں کسی خاص موضوع یا کسی عمومی موضوع پر کام کر رہے ہوں، انہیں شرق شناس کہا جاتا ہے۔اور وہ جو کام بھی کر رہے ہوں گے، شرق شناسی کہلائے گا۔یہ صحیح ہے کہ آج کے متخصصین شرق شناسی کی اصطلاح کو ''مطالعاتِ شرق'' یا ''علاقائی مطالعات'' کے مقابلے میں ترجیح نہیں دیتے۔(۵) اس کی دو وجوہات ہیں۔ایک یہ کہ یہ اصطلاح ذرا مبہم یا عمومی ہے، دوسرے یہ کہ اس میں انیسویں اور بیسویں صدی کے شروع میں یورپی نو آبادیاتی اور استبدادی نظام کی بُو باس رچی ہوئی ہے۔''(۶)

ایڈورڈ سعید کے خیال میں ''شرق شناسی'' اپنے عمومی معنی کے اعتبار سے ایک طرزِ فکر کا نام ہے جس کی

بنیادِ علم موجودات اور نظریہ علم کے مطابق اس امتیاز پر ہے جو 'خاص مشرق' اور (بسا اوقات) 'خاص مغرب' کے درمیان ہے۔ (۷) 'اورینٹلزم' کو تین ابواب اور ان کے بارہ ذیلی عنوانات کے تحت منقسم کیا گیا ہے جس کا مقصد معاملات، حالات، واقعات، نظریات اور خیالات کی توضیح وتشریح کو ممکنہ حد تک آسان بنانا ہے۔ پہلا باب 'شرق شناسی کی وسعت' پر ہے۔ اس میں شرق شناسی کے وہ تمام پہلو بیان کیے گئے ہیں جو تاریخ، تجربات اور مشاہدات سے سامنے آتے ہیں۔ یہ جائزہ فلسفیانہ اور سیاسی نوعیت کا ہے۔ دوسرے باب کا عنوان 'تشکیلات اور تشکیلاتِ نو' ہے جس میں شرق شناسی کے ارتقاء کے سلسلے میں اہم واقعات کو تاریخی اعتبار سے ترتیب وار بیان کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ان طریقوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو شرق شناس شعراء فنکاروں اور فاضلین کے تحقیقی طریقہ کار میں مشترک ہیں۔ تیسرے باب کا عنوان ہے 'شرق شناسی عصر حاضر میں' اس میں گذشتہ سے پیوستہ زمانہ یعنی ۱۸۷۰ء کے لگ بھگ سے آگے کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں یورپی استعمار اپنے عروج پر تھا۔ جس کا نتیجہ جنگ عظیم دوم کی صورت میں سامنے آیا۔ تیسرے باب کے آخر میں ذکر کیا گیا ہے کہ مشرق پر موجود برطانیہ اور فرانس کا تسلط امریکا کی طرف کیسے منتقل ہوا۔

اس طرح یہ کتاب یورپ کے نو آبادیاتی نظام، ہوس ملک گیری اور مشرق کے بارے میں ان کے نظریات پر تفصیل سے روشنی ڈالتی ہے اور ان نو آبادیات کے باشندوں کے جذبات واحساسات کی حقائق واستناد کے ساتھ وضاحت کرتی ہے۔ فلسطینی نژاد ایڈورڈ سعید نے اگر چہ امریکا میں تعلیم حاصل کی تاہم وہ برطانوی نو آبادیات میں پلے بڑھے۔ فلسطین اور مصر میں عمر کا ایک حصہ گزارا، اس لیے ان کے اپنے مشاہدات اور جذبات بھی ان کی تصنیف میں داخل ہو گئے ہیں۔

ایڈورڈ سعید کی شرق شناسی کی بنیاد تین نکات پر ہے:

۱۔ مشرق بطورِ عنصر قدرت کوئی غیر متحرک یا غیر متاثر کن چیز نہیں، بالکل مغرب کی طرح۔ مغرب کی طرح مشرق بھی ایک تصور ہے۔ جس کی اپنی ایک تاریخ، فکری روایت اور مناظر فطرت ہیں۔ علوم وفنون اور ذخیرہ الفاظ کے حوالے سے اس کا ایک اپنا تشخص ہے جس نے اسے ایک مستقل اور حقیقی وجود بنایا ہے۔ تہذیبی اور ثقافتی حیثیت کے ساتھ ساتھ جغرافیائی سطح پر بھی دونوں ایک دوسرے کی عکاسی کرتے ہیں۔

۲۔ خیالات، تمدن اور تاریخ کو اس وقت تک سنجیدگی سے نہیں سمجھا جا سکتا جب تک ان سب کی قوت وطاقت کو پیش نظر نہ رکھا جائے۔ یا بے کم وکاست ان کی وضع اور ہیئت کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ نیز مشرق ومغرب کے درمیان تعلق طاقت، اقتدار اور غلبہ حاصل کرنے کے لیے ہے۔

۳۔ کبھی یہ فرض نہیں کر لینا چاہیے کہ شرق شناسی کی تشکیل جھوٹی اور تصوراتی کہانیوں سے ہوئی بلکہ ان کے بارے میں صداقت اگر ہمارے علم میں آجائے تو ان سے متعلق جھوٹی کہانیاں ہوا میں اُڑ جائیں گی۔ شرق شناسی کا وجود مشرق پر یورپی تسلط کو قائم کرنے کے لیے ہے۔ اور اس مقصد کے لیے مغرب میں سماجی، سیاسی اور معاشی ادارے قائم کیے گئے ہیں اور یہ کام تسلسل سے جاری ہے۔ اس کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی ہے اور اس میں نسل درنسل سرمایہ کاری کی گئی ہے۔ اس سرمایہ کاری نے شرق شناسی کو ایک نظام علم بنا دیا ہے۔

مشرق میں یورپی اور پھر امریکی دلچسپی سیاسی تھی اور وہ اہل مشرق کو گھٹیا سمجھتے ہوئے اپنے مفادات کی خاطر ان سے چمٹے ہوئے تھے اس لیے یہ بات قطعاً غلط ہے کہ یورپی نوآبادیات یورپ ہی کا حصہ ہیں یا تھیں۔ بلکہ مشرق، مشرق ہے اور مغرب، مغرب۔ جے ایس مل نے اپنے مقالات آزادی اور نمائندہ حکومت (Liberty and Representative Govt.) میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ''اس کے نظریات ہندوستان میں قابل اجرا نہیں ہیں کیوں کہ اہل ہند نسلی لحاظ سے نہ سہی، تہذیبی لحاظ سے گھٹیا ہیں۔''(۸)

اہل یورپ کے احساس برتری میں مبتلا ہونے کا بہترین ثبوت ایک سابق برطانوی وزیر اعظم ''آرتھر جیمز بالفور'' کی اس تقریر سے ملتا ہے جو اس نے برطانیہ کے دارالعوام میں ۱۳ جون ۱۹۱۰ء کو کی اور وہ تقریر ایک تاریخی حیثیت اختیار کر گئی۔ اس نے مصر میں برطانوی فوج کی موجودگی کا جواز اس وقت پیش کیا جب کہ مصری قوم پرستی کی تحریک ابھر رہی تھی۔ اور مصر میں برطانیہ کی مسلسل موجودگی کا دفاع آسان نہیں تھا۔ پارلیمنٹ کے کچھ ارکان بھی مصر میں برطانیہ کی موجودگی پر معترض تھے۔ اس نے کہا:

> ''ہم مصری تہذیب کو دوسرے کسی بھی ملک کی تہذیب سے بہتر طور پر جانتے ہیں۔ ہم اس کو اس کی قدامت سے بھی پہلے سے جانتے ہیں۔ ہم اسے قریب سے جانتے ہیں اور ہم اس کے بارے میں زیادہ جانتے ہیں۔ یہ تہذیب ہماری قوم کی مختصر سی تاریخ سے بہت دور پیچھے تک جاتی ہے اور زمانہ قبل از تاریخ میں گم ہو جاتی ہے۔ جب مصری تہذیب اپنا عروج دیکھ چکی تھی۔''(۹)

اس علم اور طاقت کے گھمنڈ میں بالفور مصر پر برطانوی تسلط کا جواز پیش کر رہا ہے۔ وہ مزید کہتا ہے:

> ''کیا ان عظیم قوموں کے حق میں یہ اچھا ہے اور میں ان کی بڑائی اور عظمت کو تسلیم کرتا ہوں کہ یہ مطلق العنان حکومت ہمارے ذریعے چلائی جائے؟ میرے خیال میں یہی اچھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تجربہ بتاتا ہے کہ وہ جس حکومت کے ماتحت ہیں اس سے بہتر حکومت کی مثال ان کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ ہماری حکومت ان کے لیے بھی مفید ہے لیکن تمام مہذب مغرب کے لیے بھی مفید

ہے۔ ہم مصر میں صرف مصریوں کے لیے نہیں ہیں، اگر چہ ہم ان کے لیے بھی وہاں ہیں، تاہم وہاں تمام یورپ کے لیے بھی ہیں۔"(۱۰)

۱۸۸۲ء میں جب انگلستان نے مصر پر قبضہ کر لیا اور اعرابی پاشا کی بغاوت کو کچل دیا تو ۱۹۰۷ء تک وہاں انگلستان کا نمائندہ اور مصر کا مالک لارڈ کرومر تھا، جو اکڑ باز کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بالفور نے لارڈ کرومر کو ریٹائرمنٹ پر اس کی مصر میں کارکردگی کے عوض پچاس ہزار پونڈ انعام دینے کی تجویز کی برطانوی دارالعوام میں حمایت کی۔ بالفور نے کمال فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس اکڑ باز کو مصر کا معمار قرار دے دیا۔ اس کے الفاظ ہیں: "کرومر نے مصر بنایا۔"(۱۱)

اس کرومر کے مشرق کے بارے میں نظریات اس کی کتاب "Modern Egypt" سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یہ کتاب اس کی کارکردگی کی سرکاری روداد ہے۔ وہ مشرقی دانش کے بارے میں اپنے تاثرات یوں پیش کرتا ہے:

"مشرقی ذہن درستی سے متنفر ہے۔۔۔ درستی کی عدم موجودگی آسانی سے جھوٹ میں تبدیل ہو سکتی ہے اور جھوٹ مشرقی ذہن میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔"(۱۲)

دوسری طرف اہل یورپ کے بارے میں اسی کتاب میں اس کی رائے یہ ہے:

"اس کے مقابلے میں ایک یورپ کا رہنے والا بہت استدلالی ہے۔ حقائق کے بارے میں اس کی بات ہر قسم کے ابہام سے مبرا ہوتی ہے۔ وہ جبلی طور پر منطقی ہے۔"(۱۳)

لارڈ کرومر نے عربوں کے بارے میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے خیال میں عرب سادہ لوح، عزم و ہمت سے عاری، خوشامدی، سازشی، چالاک اور جانوروں کے معاملہ میں بے رحم ہوتے ہیں۔ اس کے خیال میں مشرق کے لوگ سڑک یا فٹ پاتھ پر نہیں چل سکتے۔ ان کے بے ترتیب اور الجھے ہوئے ذہن اس بات کو سمجھنے سے عاجز ہیں، جس کو ایک ذہین یورپی فوراً سمجھ لیتا ہے، کہ سڑکیں اور راستے چلنے کے لیے بنے ہیں۔ نیز مشرق کے لوگ زمانہ قدیم ہی سے سخت دروغ گو، کاہل، شکی المزاج اور ہر بات مین اینگلوسیکسن قوم کی صراحت، قطعیت اور شرافت کے الٹ ہوتے ہیں۔(۱۴)

جغرافیائی سطح پر بھی مغرب نے مشرق کے ساتھ یہی سلوک کیا ہے۔ اور ہر ممکن طریقہ سے لوگوں میں یہ تاثر قائم کیا ہے کہ یورپ طاقتور اور فاتح ہے جب کہ ایشیاء مفتوح۔ ایشیاء کے بارے میں دوسرا تصور یہ قائم کیا گیا ہے کہ ایشیاء خطرناک ہے۔

یورپ ہی مشرق کی حدود کا تعین کرتا ہے اور اسے اپنا فطری حق سمجھتا ہے۔ مشرق اور مغرب کی تقسیم خود

غرضانہ مقاصد کے حصول کے لیے ہے۔ دوسری صدی قبل مسیح ہی سے یہ بات سامنے آچکی تھی کہ ہیروڈوٹس (ایک مورخ، سیاح اور وقائع نوسی) اور اسکندر اعظم (بادشاہ، سائنسی اور علم سے شناسائی رکھنے والا ذہین فاتح) اس سے پہلے مشرق کا رخ کر چکے ہیں۔ ان سے مہیا کردہ معلومات کی روشنی میں مشرق کو دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا۔ معلومہ مشرق اور نا معلوم مشرق۔ جنگ جو قسم کے زائرین کے باعث اور صلیبی جنگوں کے زمانہ میں مشرق کے بارے میں معلومات میں مزید اضافہ ہوا۔ مشرق کو مزید کئی بنیادوں پر تقسیم کیا گیا۔ عیسائیت نے مشرق کے اندر بڑے بڑے حلقے بنا دیے۔ ایک کو مشرق قریب اور دوسرے کو مشرق بعید کہا گیا۔ اس کے علاوہ ایک کو سلطنت بحیرہ روم قرار دیا گیا۔ یہ معروضی جغرافیہ ہمیشہ اپنی جگہ تبدیل کرتا رہا اور اس کی مختلف درجہ بندی اور حد بندی ہوتی رہی۔

اسلام شرق شناسی کا ایک بہت بڑا اور بہت اہم موضوع ہے۔ اہل یورپ اسلام کا احترام تو نہیں کرتے البتہ اس سے خوف ضرور کھاتے ہیں۔ حضورؐ کے وصال کے بعد اسلام کو جو فتوحات حاصل ہوئیں اور اس سے تہذیبی اثر ورسوخ کو جو وسعت ملی وہ یورپ کے لیے ایک مستقل صدمے کی حیثیت رکھتی ہے اسی بناء پر یورپ اسے دہشت گردی قرار دیتا ہے اور دہشت گرد مشرق کو قابو میں رکھنا چاہتا ہے۔ اسلام کے لیے یورپ نے ''محمڈن ازم'' کی اصطلاح ایجاد کی ہے اور شارعِ اسلام کو نہایت معمولی حیثیت دی ہے۔ ''قرون وسطیٰ کے زیادہ تر عرصے میں اور یورپ کی بیداری کے ابتدائی دور میں مغرب کا تاثر یہ تھا کہ اسلام تاریکی میں ڈوبے ہوئے مرتدوں اور کلمہ کفر کہنے والوں کا شیطانی مذہب ہے۔''(۱۵)

۱۷۰۸ء میں شائع ہونے والی کتاب "History of Saracens" میں ''اوکلے'' نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ''یورپی عیسائیوں کو فلسفہ کے بارے میں جو بھی علم ہوا وہ مسلمانوں کا عطا کردہ ہے۔'' اس خیال نے یورپی حلقوں کو زبردست جھٹکا دیا اور وہ اسلام کو مسخ کرنے میں مزید کمر بستہ ہو گئے۔

شرق شناسی یا تحریکِ استشراق کی تنظیم کے بارے میں ایڈورڈ سعید لکھتے ہیں:

> ''ایک طرف تو شرق شناس نے مشرق کے بارے میں ترجمان کی ضرورت سے مغرب کو مکمل طور پر بے نیاز کر دیا اور دوسری طرف اس سے مشرق کے بارے میں علم کو مغرب کے گھر کی لونڈی بنا دیا اور اس علم کو باقاعدگی سے روشناس کرایا۔ اس کام میں علم کو coded اور Classify کیا گیا۔ اس کے نمونے تیار کیے گئے۔ اس کا وقفے وقفے سے جائزہ لیا گیا، نقلیں تیار کی گئیں، گرامر متعین کی گئی، تبصرے اور تجزیے تیار کیے گئے، کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع ہوئے، تراجم کی بھرمار ہوئی۔ اس طرح سے مشرق کا ایک ماڈل تیار ہو گیا اور اس کو مغرب میں پیش کیا گیا اور یہ ماڈل مغرب کے لیے ہی تھا۔''(۱۶)

غیر معمولی بات یہ ہے کہ یہ خیالات اور نظریات مشرق پر کی جانے والی عملی اور سرکاری تحقیق میں بغیر کسی قابل توجہ اختلاف کے جاری وساری ہیں۔ یہ بات نہایت قابلِ افسوس ہے کہ اگر شرق شناسی کے اصولوں پر مسلمان یا عرب دانش وروں کی طرف سے اختلاف کیا جاتا ہے یا اس صورت حال کو چیلنج کیا جاتا ہے تو اس کا اثر نظر نہیں آتا۔

❁❁❁

حوالہ جات وحواشی

۱۔ پیرمحمد حسن، مستشرقین کی تحقیقات پر تحقیق کی ضرورت، مشمولہ: 'فکرونظر'، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی اسلام آباد، مئی ۱۹۷۶ء ،جلد۱۳،شمارہ ۱۱، ماہنامہ ص ۴۲

۲۔ رضیہ نور محمد، ڈاکٹر مس، اُردو زبان اورادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، لائن آرٹ پرنٹرز میکوڈ روڈ لاہور، ۱۹۸۵ء مقدمہ۔

۳۔ ایڈورڈ ڈبلیوسعید، اسلام اور مغربی ذرائع ابلاغ، ترجمہ: ظہیر جاوید، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۲۶۰

۴۔ ایڈورڈ سعید، ثقافت اور سامراج، ترجمہ: یاسر جواد، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص viii۔

۵۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انگلش کی اکثر ڈکشنریاں Orientalism یا Orientalist کی وضاحت کرتے ہوئے شرماتی ہیں۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے علاوہ دیگر کسی ڈکشنری میں ان اصطلاحات کی وضاحت خال خال ہی نظر آتی ہے۔ یا پھر شاید تحریکِ استشراق کے عزائم کو اخفاء میں رکھنا مقصود ہے۔

۶۔ ایڈورڈ سعید، ''شرق شناسی''، ترجمہ: محمد عباس، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، ص ۲

اگر اس ترجمہ کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو بعض جملے خاصے مبہم محسوس ہوتے ہیں، جس کا سبب ممکن ہے ثانوی ماخذ کے طور پر اس کتاب کے فارسی ترجمہ سے مدد حاصل کرنا ہو جو اُردو ترجمہ سے پہلے طبع ہو چکا تھا۔ زیرِ نظر ترجمہ ''شرق شناسی'' کی سب سے بڑی خامی آخر میں حوالہ جات اور حواشی کا موجود نہ ہونا ہے جنہیں حذف کرنے کا اختیار مقتدرہ قومی زبان کے پاس نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ متعلقہ حضرات تحقیقی مقالہ میں حوالہ جات اور کتابیات کی اہمیت سے سراسر نابلد ہیں۔ ''شرق شناسی'' میں چند ایک فرانسیسی محاورات یا ضرب الامثال کا اندراج بعینہٖ کر دیا گیا ہے۔ شاید ان کی تفہیم مترجم کے لیے ممکن نہیں ہو سکی۔ پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں دانتے کے ایک دو اقتباسات کو بھی گستاخانہ ہونے کی وجہ سے مصلحتاً خذف کر دیا گیا ہے۔

۷۔ ایڈورڈ سعید، شرق شناسی، ص ۳

۸۔ ایضاً، ص ۱۶

۹۔ ایڈورڈ سعید نے اس تقریر کے مآخذ کا اندراج یوں کیا ہے:

This and the preceding quotations from Arthur James Balfour's

speech to the House of Commons are from Great Britain, Parliamentry Debates (Commons), 5th ser; 17(1910): 1140-46. See also A.P. Thornton, The Imperial Idea and Its Enemies: A study in British Power (London: Mac Millan & Co., 1959), P. 357-60. Balfour's speech was a defence of Eldon Gorst's policy in Egypt; for a discussion of that see Peter John Dreyfus Mellini, "Sir Eldon Gorst and British Imperial Policy in Egypt,"

Unpublished Ph.D. dissertation, Stand ford University, 1971.

۱۰۔ ایڈورڈ سعید، شرق شناسی، ص ۳۸

۱۱۔ اس سلسلے میں درج ذیل حوالہ پیش کیا گیا ہے:

Denis Judd, Balfour and the British Empire: A study in Imperial Evolution,

1874-1932 (London: Mac Millan & Co., 1968), P.286. See also p.292: as late as 1926 Balfour spoke-without irony- of Egypt as an "independent nation."

۱۲۔ ایڈورڈ سعید، شرق شناسی، ص ۴۴

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۵

۱۵۔ ایڈورڈ سعید، اسلام اور مغربی ذرائع ابلاغ، ص ۸۰

۱۶۔ ایڈورڈ سعید، شرق شناسی، ص ۱۸۴